ڈاکٹر محمود الحسن

اسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو،

نیشنل یونیورسٹی، آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اُردو ناول کے فنی ارتقا میں اولین ناول نگاروں کا حصہ

Genre of novel was borrowed from the west and it shifted here. The West gave birth of very ideology and it becomes an integral part of Urdu literature through novel. Old genres of story, fable and fiction of Urdu literature got a new name called novel. Through this research paper, it has been endeavoured; there are shortcoming in structure, plot topic style, characterization, dialogue. Despite this shortcoming, we can't deny this point that the earliest writers shaped novel in its true sense by giving story a new dimension. Consequently, Urdu tales were transformed into a new refined look. It can be said that the earliest novelists realized echoes of regional and international changes and moulded their art and idealogy accordingly. In contemporary Urdu novel culminated to a lofty point and the earliest novelists contributed a lot in this regard.

ملخص: ہمارے ہاں ناول مغرب سے آیا۔ مغرب نے جس فکر و نظر کو جنم دیا وہ ناول کے ذریعے اردو زبان وادب کا حصہ بنا۔ اردو ادب کی قدیم اصناف کہانی، داستان اور قصہ کا ایک نیا نام تجویز ہوا جو ناول کہلایا۔ زیر نظر مضمون میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ اولین ناول نگاروں کے ناولوں میں فنی لوازم مثلاً ہیئت، پلاٹ، موضوع، اسلوب، کردار اور مکالمہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ فکری حوالے سے بھی نقائص موجود ہیں۔ مگر ان نقائص کے باوجو اس امر سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ ان ابتدائی لکھنے والوں نے داستان اور کہانی کو نیا رخ دے کر ناول کی حقیقی صورت عطا کی اور اردو قصے کو ایک نیا وجود بخشا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اولین ناول نگاروں نے علاقائی اور عالمگیر سطح پر ابھرنے والی تبدیلیوں کی بازگشت کو محسوس کیا اور اس کے مطابق اپنے فکر و فن کو ڈھالا۔ اردو ناول آج جس مقام پر کھڑا ہے اس میں اولین ناول نگاروں کا بنیادی حصہ ہے۔

کلیدی الفاظ:

خمیر، ہیئت، معیار، فسانہ عجائب، تمثیلی مثالیت، ناول، مراۃ العروس، شخصیت، فنی، ناقدین، پلاٹ، دیہاتی زندگی، تشکیل نو، بیانیہ، معاشرت۔

ناول ایسی کہانی ہے جس کا خمیر انسانی زندگی سے اٹھایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر انسان ایک چلتی پھرتی کہانی ہے۔ اس طرح اس دھرتی پر ہمیں ان گنت اور بے شمار کہانیوں کو پرکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ایک ناول نگار انہی کہانیوں میں سے کسی ایک کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے بعد انسانی ذہن اس کہانی میں موجود ہیئت، اسلوب، رجحانات، واقعات اور حالات کا تمام معاشرے سے تقابل کرتا ہے۔ اس طرح وہ اس کے معیار کا تعین کرتا ہے اور سلسلۂ ادب آگے بڑھتا رہتا ہے۔

شاعری وہ صنف سخن ہے جو دنیا کی ہر زبان میں سب سے پہلے وجود میں آئی اور ادب کہلائی۔ تاہم گردشِ دوراں کے پیش نظر قدیم قصے اور کہانیاں جو لوگوں کے سینوں میں محفوظ تھیں اور نسل در نسل آنے والی نسلوں تک منتقل ہو رہی تھیں۔ وہ بھی تحریری صورت اختیار کر گئیں۔ اس طرح قصے کہانیوں کی شکل میں افسانوی نثری تحریروں کی ابتداء ہوئی۔ اس ضمن میں یونان، مصر، فلسطین، مہابھارت، چین وغیرہ پیش پیش رہے کیونکہ کسی زمانے میں یہی خطے دنیا میں علم و

دانش اور تہذیب و تمدن کے مرکز رہے ہیں۔ قصے، کہانیاں قدیم دور سے ہی انسان کو بہت محبوب رہے ہیں۔ انہی داستانوں میں سے کئی داستانیں اپنی دلچسپی کی وجہ سے آج بھی مقبول عام ہیں۔ سیاح اور تاجر اپنے اپنے کام کی وجہ سے شہر شہر، ملک ملک اور قریہ قریہ سفر کرتے تھے اور انہی داستانوں کی صورت میں بلاارادہ ادب کے ابلاغ کا باعث بھی بنتے تھے۔ اسی لیے آج بھی کئی داستانیں مثلاً گل بکاؤلی، الف لیلیٰ وغیرہ کی کہانیاں عالمی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ جب ہم اردو داستانوں کی بات کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی ابتدائی داستانیں دوسری زبانوں کی داستانوں کا ترجمہ ہیں۔ ان ابتدائی داستانوں کا ماخذ سنسکرت، عربی اور فارسی داستانیں ہیں۔ جس طرح اردو شاعری کے آغاز و ارتقا میں سرزمین دکن کی خدمات قابل قدر ہیں اسی طرح اردو نثر کی ابتدا اور فروغ میں بھی اس کا کردار متاثر کن رہا ہے۔ ''سب رس'' جسے ملا وجہی نے ۱۶۳۵ء میں تحریر کیا اردو کی قدیم ترین نثری کہانی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد اردو داستانوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر سے اردو داستانوں کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۷۷۵ء میں ہمیں تحسین کی ''نوطرز مرصع'' ملتی ہے اسکے بعد فورٹ ولیم کالج نے کئی معروف داستانوں کا ترجمہ شائع کیا اور ساتھ ہی طبع زاد کہانیاں بھی لکھوائیں۔ اور فورٹ ولیم کالج سے باہر بھی گراں قدر داستانیں تخلیق ہوئیں۔ اس سے قبل مثنوی کی صورت میں منظوم قصے بھی ملتے ہیں۔ رجب علی بیگ سرور کی داستان ''فسانۂ عجائب'' اور میر امن دہلوی کی داستان ''باغ و بہار'' نے بے حد شہرت حاصل کی۔ دونوں داستانیں دو الگ الگ مکاتب خیال کے اسلوب کی ترجمان ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی فسانۂ عجائب کی زبان و بیان کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فسانۂ عجائب میں مکالمہ نگاری بھی انتہائی جاندار ہے ہر پیشہ ور کی زبان الگ ہے اور وہ اپنے پیشے کی اصطلاحات بڑی خوبی سے استعمال کرتا ہے۔(۱)

ان خصوصیات نے ''فسانۂ عجائب'' کو ناول کی ضد ہونے کے باوجود ناول سے بہت قریب کر دیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے فوراً بعد ہندوستان کی پوری فضا میں انقلاب برپا ہوا۔ تعلیمی نظریات میں بھی تبدیلی آئی اور ادبی لحاظ سے بھی کئی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ تاریخ میں یہ وہ دور ہے جب پرانی اقدار تیزی سے شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھیں۔ مغرب ہر میدان میں مشرق پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ ادب بھی اس نئے رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب میں کثرت سے مغربی اثرات رونما ہوئے۔ اوّل اوّل ان اثرات کو رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' (۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء) میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس رسالے کے بیشتر مضامین مغربی تخلیق کاروں کے مضامین کے ترجمے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی مثال محمد حسین آزاد کی کتاب ''نیرنگ خیال'' (۱۸۸۰ء) اور عبدالکریم کی '' الف لیلہ '' (۱۸۸۴ء) ہیں۔ جن میں انگریزی سے اردو تراجم کیے گئے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے ''نیرنگ خیال'' میں جانسن کے کئی مضامین کے تراجم پیش کئے ہیں۔ ان تراجم سے یہ فائدہ ہوا کہ والٹر اسکاٹ، میری کوریلی، گولڈ اسمتھ اور ڈاکٹر جانسن کے بہترین ناول اردو میں ترجمہ ہوئے۔ انہی تراجم کی بدولت اردو ادب کی قدیم اصناف کہانی، داستان اور قصہ کا ایک نیا نام تجویز ہوا جو ''ناول'' کہلایا۔ اس نام کو رتن ناتھ سرشار اور عبدالحلیم شرؔر نے اپنی اپنی تخلیقات کے لیے استعمال کیا۔ بہر حال مولوی نذیر احمد کے تمثیلی قصے جو انہوں نے مغربی ادب سے متاثر ہو کر لکھے تھے۔ اردو ناول کا بنیادی پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ زمانی اعتبار سے ''مرآۃ العروس'' (۱۸۶۹ء) ''بنات النعش'' (۱۸۷۲ء) کو باقیوں پر برتری حاصل ہے۔ اور یہی قصے اردو قصے کو داستان کی خیالی دنیا سے سب سے پہلے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں مولوی کریم الدین کا تمثیلی قصہ ''خط تقدیر'' (۱۸۶۴ء) بھی لکھا گیا۔ جس کو ڈاکٹر محمود الٰہی نے اردو کا پہلا ناول ثابت کرنے کی کوشش کی۔ تاہم یہ خاص تمثیلی قصہ ہے جس کو ''سب رس''، ''باغ و بہار'' وغیرہ کی روایت کا تسلسل کہا جاسکتا ہے۔

مولوی نذیر احمد کو اردو ناول کی تاریخ میں بلند مقام حاصل ہے۔ یہ ایسے عہد سے تعلق رکھتے ہیں جہاں قدیم اور جدید ادبی اقدار آپس میں ملتی ہیں۔ ان

کی مثال ایک ایسے سنگم کی سی ہے جس سے گزر کر داستان، ناول کی صورت سے آشنا ہوتی ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ خاص مقاصد کے حصول کے لیے نذیر احمد نے اپنے کرداروں میں مثالیت پیدا کر دی تھی۔ جسے آج کا قاری ناپسند کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ان ناولوں میں فنی لوازم کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ تاہم ان نقائص کے باوجود اس حقیقت سے نظریں چرانا ممکن نہیں ہے کہ اردو ناول کی تاریخ میں نذیر احمد وہ نام ہے جس نے خیالی داستان کو نیا رخ دے کر حقیقی دنیا کی شکل عطا کی اور اردو قصے کو ایک نیا وجود بخشا۔ وقار عظیم لکھتے ہیں:

داستان کی خیالی دنیا کی جگہ ان قصوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں ان ٹھوس حقیقتوں سے دوچار ہونے والے ہم سے آپ سے ملتے جلتے کردار نظر آتے ہیں۔۔۔ یہ قصے، قصہ گوئی کے ایک نئے اسلوب اور فن کے ایک نئے دور کی آمد کا پیش خیمہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس مفہوم میں ناول نہیں ہیں جو ہم نے مغرب سے لیا ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ناول کی داغ بیل انہی قصوں نے ڈالی۔(۲)

مولوی نذیر احمد کے ابتدائی قصوں میں ہمیں فنی کمزوریاں دکھائی دیتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں واضح کمی واقع ہوئی ہے۔ ''مرآۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' کے بعد لکھے جانے والے ''توبۃ النصوح'' (۱۸۷۳ء) ''فسانۂ مبتلا'' (۱۸۸۵ء) اور ''ابن الوقت'' (۱۸۸۸ء) کا مطالعہ کیا جائے تو واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ کئی قصے لکھنے کی وجہ سے ان کی تحریر میں پختگی پیدا ہوگئی تھی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انھیں مغربی ناولوں کے پڑھنے کا موقع بھی ملا تھا۔ ایک نقاد کے بقول:

''بنات النعش'' پر تھامس ڈے کے ناول ''History of Sanford and Merton'' (۱۷۷۳ء) کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں جبکہ توبۃ النصوح کا پلاٹ ڈینیل ڈیفو کے مذہبی ناول دی فیملی آف انسٹرکٹر The Family of Instructor (۱۷۱۵ء) سے ماخوذ ہے۔(۳)

مولوی صاحب کے اس فنی ارتقا کا اردو ادب کو یہ فائدہ ہوا کہ کلیم، مرزا ظاہر دار بیگ اور ابن الوقت جیسے بے مثال کردار وجود میں آ گئے جو مثالی سے کہیں زیادہ حقیقی نظر آتے ہیں۔ نذیر احمد نے ناول کے فن کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے روزمرہ مسائل پر قلم اٹھایا اور ایسے اصلاحی نقطے بیان کیے جن کا معاشرتی اخلاق سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں نوجوان لڑکیوں کی اصلاح آوارہ لڑکوں کی تعلیم و تربیت، خیر و شر کی قوتوں کے درمیان رسہ کشی جھلکتی دکھائی دیتی ہیں۔ مکالمے بڑے بھرپور ہیں۔ عورتوں کی روزمرہ گفتگو پر انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان تمام خصوصیات نے مولوی نذیر احمد کے فن میں ایسی قوت پیدا کر دی کہ نقاد ان کی تحریروں کو ناول تسلیم نہ کرنے کے باوجود ناول کی ابتدائی شکل ماننے پر مجبور ہوگئے۔ اس بارے میں ڈاکٹر احسن فاروقی لکھتے ہیں:

ان تمام مجسموں سے مولانا کی زندگی میں گہری دلچسپی، نفسیاتِ انسانی کا گہرا علم اور اس زندگی اور نفسیات کو ایک خاص فن کے ماتحت خوبصورتی کے ساتھ ادا کرنے کی اعلیٰ صلاحیت کا پتہ چلتا ہے ان سے پہلے اردو میں کوئی مصنف زندگی کا اتنا گہرا اور سچا نقاد نہیں گزرا ایک حد تک یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو میں زندگی پر تنقید انہی سے شروع ہوتی ہے۔۔۔ اس لیے مولانا اردو میں تمام جدید ادب کے سب سے پہلے پیش رو کہلانے کے مستحق ہیں ان کے بعد فن افسانہ گوئی نے بہت ترقی کی اور اردو میں ناول کا فن بھی آیا مگر اب تک کسی کی تصنیفات میں زندگی کے اتنے جیتے جاگتے نقوش نہیں ملتے جتنے ان کے یہاں۔(۴)

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولوی نذیر احمد کے ناولوں میں ہیئتی، اسلوبیاتی، ماجرائی اور دیگر کمزوریوں کے باوجود انھیں اردو ناول کا پیش رو کہا جاتا ہے اور انہوں نے ان ناولوں میں ایسے کردار پیش کیے جو زندگی کے جیتے جاگتے نقوش ہیں۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کا تعلق لکھنو سے تھا۔ ان کے ناولوں میں اودھ کی جھلکیاں واضح دکھائی دیتی ہیں۔ سرشار کے مشہور ناول فسانہ آزاد (۱۸۷۹ء)،

جام سرشار(۱۸۸۰ء) سیر کہسار(۱۸۹۰ء) کامنی(۱۸۹۴ء) وغیرہ ہیں۔ فسانۂ آزاد ایک عمدہ ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب و تمدن کو بڑی مہارت سے بیان کیا گیا ہے۔ سرشار نے لکھنؤ کی خواتین کی زبان، رہن سہن، معاشرتی زندگی اور وہاں کے رسم ورواج کو بڑی فنکاری سے بیان کیا ہے۔ ناول کے کرداروں اور مکالموں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اس معاشرے کے ہر طبقے، پیشے اور قوم وملّت کے افراد سے واقفیت رکھتے ہیں۔ جام سرشار ایک اصلاحی ناول ہے۔ اس میں شراب نوشی کے نقصانات کو بیان کیا گیا ہے۔ گورتن ناتھ مسلمان نہیں تھے لیکن ان کی تربیت لکھنؤ کے مسلم معاشرے میں ہوئی تھی اس لیے ان کی تحریروں میں اصلاحی کلچر غالب ہے۔ ان کے ناولوں کا فنی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناول کی ہیئت میں سب سے زیادہ کردار نگاری پر توجہ دیتے ہیں۔ ڈاکٹر احسن فاروقی کہتے ہیں کہ ”سرشار کے یہاں تمام تر زور کردار نگاری ہی پر ہے“ (۵) جبکہ ڈاکٹر رشید احمد گوریجہ نے لکھا ہے:

سرشار نذیر احمد کی نسبت اعلیٰ پائے کے قصہ گو معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے فوجی کی صورت میں اعلیٰ پائے کا کردار بھی تخلیق کیا۔(۶)

سرشار سے متعلق ناقدین فن کا خیال ہے کہ وہ ایک بڑا ناول نگار ہے ان کے مقابلے میں مولوی نذیر احمد وغیرہ نہیں آسکتے۔ اسکاٹ کی طرح سرشار نے قدیم فن کے خلاف بغاوت کی ہے۔ اس کے ناولوں میں صحیح معنوں میں طبقاتی کشمکش ہے۔ نوابین اور سرمایہ دار ہیں۔ دوسری طرف وہ چھوٹا یا نچلا طبقہ ہے جو اونچے طبقے کا محتاج ہے۔

سرشار کے ناولوں میں ہیئت اور تکنیک کا خیال رکھا گیا اس میں پلاٹ اور واقعات میں مناسب خیال رکھا گیا ہے۔ کردار بھی واضح ہیں۔ ماجرے کو بڑی روانی سے آگے بڑھاتے ہیں جس سے وحدت تاثر ابھرتا ہے۔ سرشار اپنا منفرد اسلوب رکھتے ہیں جس پر ان کی طبیعت اور شخصیت کا رنگ غالب ہے۔

سرشار کے اسلوب بیان میں جس چیز کو عمومیت یا عامیانہ پن سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کا سبب ان کی طویل نگاری ہے۔

مولوی عبدالحلیم شرر اہم ناول نگار ہیں ان کے مشہور ناول ”ملک العزیز ورجینیا“، ”حسن انجلینا“، ”منصور موہنا“، ”فردوس بریں“، ”ایام عرب“، ”بدر النسا کی مصیبت“، ”حسن کا ڈاکو“، ”طاہر اور زوال بغداد“ وغیرہ ہیں۔ شرر کے زیادہ تر ناول تاریخی ناول ہیں۔ ”فردوس بریں“ فن کے لحاظ سے ان کا اہم ناول ہے جس میں حسن بن صبا کی مصنوعی جنت اور فرقہ باطنیہ کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ”زوال بغداد“ میں مسلمانوں کے فرقہ وارانہ انتشار و افتراک کا ذکر ہوا ہے۔ مصنف نے ناول کے ذریعے سے مسلمانوں کی باہمی منافرت کا تذکرہ کیا اور اس منافرت سے ہونے والی تباہی کا ذکر کیا ہے اور مسلمانوں کو اپنے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کا درس دیا ہے۔ سید وقار عظیم شرر کے ناولوں کی خوبیوں اور خامیوں پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

زندگی اور فن کے متعلق لوگوں کی رائے جس طرح بدلتی رہے گی اس طرح شرر اور ناولوں کی محبوبی کے مدارج بھی بدلتے رہیں گے۔ لیکن فنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اس مدوجزر میں کچھ چیزیں بہرحال پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جائیں گی۔ ان کچھ چیزوں میں شرر کے شگفتہ ادبی اور سلیس اسلوب بیان اور ان کے محبوب طرز افسانہ گوئی کے علاوہ ان کے ناولوں کے کردار بھی شامل ہیں اور ان بعض کرداروں میں سے شرر کے ناول فردوس بریں کا سب سے نمایاں کردار ”شیخ علی وجودی“ ہے جسے بعض حیثیتوں سے شرر کے کرداروں میں سب سے اونچا کردار کہا جا سکتا ہے۔(۷)

ڈاکٹر قمر رئیس نے شرر کی ناول نگاری پر رائے دیتے ہوئے کہا ہے :

شرر اردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے شعوری طور پر ناول کے فن کو سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی ہے اور اپنے ناول کی تکمیل میں بعض اجزائے فنی کا لحاظ رکھا۔(۸)

بعض ناقدین نے شرر کے ناولوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان کی گفتگو یکسانیت کا شکار ہے اور وہ اپنے کرداروں سے ایک ہی قسم کی گفتگو کرواتے چلے جاتے ہیں جس سے پڑھنے والا اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شرر کے ناول بعض دیگر خصوصیات بھی لیے ہوئے ہیں مثلاً شرر نے قاری کی دلچسپیوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ ان کے ناولوں کے مطالعہ سے فن کا تاثر ابھرتا ہے اور قاری آسانی کے ساتھ حقائق کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے۔ شرر کے ناول خوبصورت ہیئت میں ڈھلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے ناول تاریخ کے کسی اہم حصے کے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود قاری پر ایک رومانوی تاثر چھوڑ دیتے ہیں۔ رومانوی فضابندی سے شرر نے اپنے ناولوں کو نہ صرف دلچسپ بنادیا بلکہ اردو ناول نگاری کو ایک نئی جہت بھی عطا کی۔

منشی سجاد حسین نے اردو ناول نگاری کو مزاحی رنگ دیا۔ ''احمق الدین''، ''حاجی بغلول''، ''کایاپلٹ''، ''میٹھی چھری''، ''طرح دار لونڈی''، ''حیات شیخ چلی''، ''پیاری دنیا'' وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں مغربی تہذیب و تمدن کا مذاق اُڑایا اور مشرقی تہذیب کے خدوخال کو بڑی عمدگی سے اجاگر کیا ہے۔ جدّت طرازی ان کے ناولوں کی بڑی پہچان ہے۔ مرزا محمد ہادی رسوا اردو ناول نویسوں میں پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے اردو ناول نگاری کو ایک نیا مقام دیا۔ '' افشائے راز''(۱۸۹۶ء)''شریف زادہ اور ذات شریف'' (۱۹۰۰ء)''اختری بیگم ''اور ''امراؤجان ادا''(۱۸۹۹ء) وغیرہ رسوا کے اہم ناول ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں ریاست اودھ کے معاشرے کی چند اہم شخصیات کو کرداری شکل دے کر پوری معاشرت آشکار کردی۔ ان تمام ناولوں میں ''امراؤجان ادا'' رسوا کا شاہکار ناول ہے۔ اس ناول میں امراؤجان ادا نے داستان کے سہارے لکھنؤ کی معاشرتی زندگی کو بیان کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ جس سے اس عہد کا لکھنؤ اپنے تمام رموز و نکات کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔

اردو ادب میں صرف دو ناولوں کو ہر طرح سے ناول کہا جاتا ہے۔ ایک سرشار کا'' فسانۂ آزاد ''اور دوسرا رسوا کا ''امراؤجان ادا''۔ ''ہیئت کی بے پروائی'' کے باوجود سرشار کو کامیاب ناول نویس سمجھا جاتا ہے جبکہ مقابلتاً مرزا ہادی رسوا نے ہیئت کا حد سے زیادہ خیال رکھا جس طرح ایک ریاضی دان کو کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی امراؤجان ادا کے بارے میں لکھتے ہیں:

امراؤجان ادا ہی اردو میں ایک پورا پورا ناول ہے۔ ناول ایک خاص صنف ادب ہے جس میں نفسیاتی دلچسپی، ڈرامائی تصادم، پیچیدگی اور قرین قیاس کردار نگاری کا ایک مخصوص فارم یا سانچے میں ڈال کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ واقفیت کا اثر پیدا ہو۔ امراؤجان ادا ہی ایک اردو کا ناول ہے جو اس تعریف پر پورا اترتا ہے۔(۹)

ناول کی وہ خصوصیت جو زندگی کے بے ربط واقعات کو ایک مربوط لڑی میں پرو کر اور بے مقصد زندگی میں قدروں کی تخلیق کر کے اسے ناول کی ہیئت عطا کرتی ہے وہ اس کے کردار ہیں۔ عہد رواں کا قاری ناول میں سب سے پہلے کردار نگاری کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رسوا کو آج بھی جو شہرت حاصل ہے وہ اس کی کردار نگاری کی بدولت ہے۔ ڈاکٹر احسن فارقی لکھتے ہیں:

کردار نگاری کے سلسلے میں رسوا کی ہوش مندی کم نہیں چاہے ان کی تخلیقی قوت کچھ کم معلوم ہو ''امراؤجان ادا'' کا ہر کردار نہایت صاف، نمایاں اور سڈول ہے۔(۱۰)

رسوا کے مکالمے مختصر ہوتے ہیں ان کے کردار ڈپٹی نذیر احمد کے کرداروں کی طرح لمبی لمبی بحثوں میں مبتلا نظر نہیں آتے۔ ان کے مکالموں میں حقیقی گفتگو کی شان نظر آتی ہے۔ مرزا رسوا کے ناولوں میں پلاٹ کی تنظیم وترتیب نظر آتی ہے۔ ان کا کوئی بھی ناول دیکھ لیں خواہ وہ امراؤجان ادا ہو یا شریف زادہ پلاٹ ایک ہی معیار کا نظر آتا ہے۔ ناول کے ماجرے میں جہاں انھوں نے واقعات کے منطقی ربط کو ملحوظ رکھا وہیں قارئین کی دلچسپی کو سامنے رکھتے ہوئے اعلیٰ احساس تناسب کا ثبوت دیا۔ اسلوب ایسا پرکشش ہے کہ دلچسپی کا دامن کہیں نہیں چھوٹنے پاتا۔ یہیں سے اردو ناول میں ایک نئے اسلوب کا آغاز ہوا۔ رسوا کی حد تک یہ اسلوب بہت پسند کیا گیا۔

محمد علی طیب اور علامہ راشد الخیری نے شرر کی تقلید کی لیکن ان دونوں ناول نویسوں نے جو ناول تخلیق کیے وہ فنی واسلوبیاتی اعتبار سے شرر کے مرتبے تک نہ پہنچ سکے۔ محمد علی طیب نے تاریخ کو مسخ کیا۔ ہیئتی اعتبار سے دیکھیں تو انھیں پلاٹ سازی کا بھی کوئی تجربہ نہ تھا۔ انھوں نے شرر سے متاثر ہو کر اپنے رسالے "مرقع عالم" میں تاریخی قصے لکھنے شروع کر دیے تھے۔ راشد الخیری کے ناولوں کا تجزیہ کریں تو ناولوں کی ہیئت مجموعی طور پر کمزور ہے۔ پلاٹ سازی اچھی ہے لیکن کردار نگاری اور مکالمہ نگاری اعلیٰ پائے کی دکھائی نہیں دیتی۔ بیانیہ اچھا ہے لیکن تاریخی حقائق سے روگردانی کرتے ہیں جس کی وجہ سے ناول نگاری میں اعلیٰ مقام حاصل نہیں کر سکے۔ مولانا الطاف حسین نے بھی ایک ناول مجالس النساء کے نام سے تحریر کیا۔ ناول کو پھیلانے کے لیے حالی نے جزئیات کا سہارا لیا البتہ مکالمے فطری اور برمحل ہیں۔ اس کا موضوع عورتوں کی تہذیب سے متعلق ہے۔

ریاض خیر آبادی اردو ادب کے مشہور شاعر ہیں خیر آبادی نے "حرم سرا"، "نظارہ"، "ناشاد" اور "تصویر" وغیرہ کے عنوانات سے ناول لکھے۔" ناشاد" اور "تصویر" طبع زاد ہیں جبکہ باقی ناول انگریزی ناولوں سے ماخوذ ہیں۔ شاد عظیم آبادی نے ایک ناول "صوت الخیال" تحریر کیا ہے۔ جس میں معاشرتی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ رشید احمد گوریجہ کے بقول:

"یہ تمثیلی انداز کا ناول ہے اور پلاٹ غیر فطری ہے۔ کردار نویسی مناسب اور مکالمہ نگاری موثر ہے۔" (۱۱)

مرزا محمد سعید نے بطور ناول نگار شہرت حاصل کی اُن کے دو ناول " خواب ہستی "۱۹۰۵ء اور "یاسمین" ۱۹۰۸ء میں تحریر ہوئے۔"خواب ہستی" کا ہیرو عثمان معاشرے کی تبدیلیوں اور انتشار وافتراک کے باعث اپنی راہ کا تعین نہیں کر سکا۔ ایسے حالات میں جب مادیت اور روحانیت برسرپیکار ہوں۔ افراد سماج میں اپنا ذہنی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے۔ اس نفسیاتی کیفیت کو بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا۔ "یاسمین" ایک مقصدی ناول ہے۔ انسانی فطرت اور نفسیاتی آگہی ناول میں جگہ جگہ موجود ہے۔ مذکورہ ناولوں میں مکالمے مختصر ہیں، کردار نگاری میں بھی زیادہ پختگی نہیں اور اسلوب میں بھی کشش نہیں ہے۔ قاضی سرفراز حسین عزمی نے کئی ناول تحریر کیے ہیں۔ ان میں "شاہد رعنا" (۱۸۹۷ء) "سعید" (۱۸۹۸ء) "سعادت" (۱۸۹۸ء) "شراب عیش"، "انجام عیش" اور "بہار عیش" وغیرہ اہم ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے طوائف کی خانگی زندگی اور معاشرے پر اس کے اثرات پر روشنی ڈالی ہے۔ ناولوں کے ذریعے طوائفوں کی اصلاح شاید مصنف کا مطمع نظر ہے۔ قاضی سرفراز اور مرزا رسوا دونوں نے طوائف کو موضوع سخن بنایا ہے۔ لیکن قاضی سرفراز کے ناول امراؤجان ادا کے مقابلے میں فنی و ہیئتی اعتبار سے کمزور ہیں۔ بقول سہیل بخاری:

موضوع تو امراؤجان ادا کا بھی وہی ہے جو عزمی کے ناولوں کا ہے لیکن یہاں اس کا ذکر کرنا گویا چاند کو گرہن لگانا ہے۔ (۱۲)

مولانا راشد الخیری بیسویں صدی کے معروف ناول نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ جنھوں نے کئی ناول تحریر کیے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں خواتین

کی بھلائی اور بہتری کو موضوع بنایا۔ اور اصلاحی ناول تخلیق کیے۔ ۱۸۹۷ء میں "صالحات"، ۱۸۹۸ء میں "منازل السائرہ"، ۱۹۰۷ء میں "صبح زندگی"، ۱۹۱۷ء میں "شام زندگی"، ۱۹۱۷ء میں "طوفانِ حیات"، ۱۹۱۸ء میں "حسن میمونہ"، ۱۹۱۹ء میں "شب زندگی" (حصہ اوّل) ۱۹۲۰ء میں "اندلس کی شہزادی"، ۱۹۲۳ء میں "شب زندگی" (حصہ دوم) ۱۹۲۳ء میں "تربیت نسواں"، ۱۹۲۷ء میں "نوحہ زندگی"، ۱۹۳۱ء میں "یاسمین و شام" وغیرہ ان کے اصلاحی ناول ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے "شاہین دراج"، "محبوبہ خاوند"، "ماہ عجم"، "عروس کربلا"، "تیغ کمال"، "آفتاب دمشق" اور "منظر طرابلس" وغیرہ جیسے تاریخی ناول بھی تحریر کیے ہیں۔ مولانا راشد الخیری کے ناولوں کا میدان خاص کر مسلمان عورت کی معاشرتی زندگی ہے۔ انھوں نے حقوق نسواں کے لیے نہ صرف قلم اٹھایا بلکہ اپنی تمام عمر بھی طبقہ نسواں کی حمایت اور بہتری میں صرف کر دی۔

راشد الخیری اپنے تبلیغی مقصد کو نہیں بھولتے اس کے برعکس مشرقی تہذیب اور روایات کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی تصنیفات دلکش و دلآویز تبلیغی رومان ہیں نہ کہ حقیقت کے ترجمان ناول (۱۳)

راشد الخیری کے ناولوں کا ہیئتی اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پلاٹ دہرا ہوتا ہے تاریخی واقعات کے ساتھ رومانوی واقعات بھی بیان ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں پلاٹ سازی کا رجحان تو ہے لیکن درمیان میں قارئین سے براہ راست مخاطب ہونے کی وجہ سے ان کے پلاٹ بھدّے ہو جاتے ہیں جبکہ اسلوب نگارش عمدہ ہے۔ علامہ راشد الخیری کے ہاں کردار نگاری اور مکالمہ نگاری اعلیٰ درجے کی نہیں ہے۔ ماجرا خوب ہے لیکن تاریخی حقائق سے روگردانی کے باعث علامہ راشد الخیری اردو ناول میں قابل قدر مقام نہ بنا سکے۔

منشی پریم چند کا نام اردو ناول میں کئی حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ناول نگاری کا ایک عہد ہیں جس میں ناول ارتقا کرتا ہوا نظر آتا ہے جس قدر ذہنی ارتقاء پریم چند کے ہاں ملتا ہے اس کی نظیر اردو کے کسی ناول نویس کے ہاں نہیں ملتی۔ انھوں نے پہلے مختصر افسانے اور بعد میں ناول لکھا۔ ان کا پہلا ناول "اسرار معابد" تھا جو بنارس کے ایک ہفتہ وار اخبار "آواز خلق" میں اکتوبر ۱۹۰۳ء سے فروری ۱۹۰۵ء تک قسط وار شائع ہوتا رہا۔ "ہم خرما و ہم ثواب" (۱۹۰۴ء) "جلوہ ایثار" (۱۹۱۲ء) "بازار حسن" (۱۹۲۲۔۱۹۲۱) "چوگان ہستی" (۱۹۲۷ء) "بیوہ" (۱۹۲۷ء) "گوشہ عافیت" (۱۹۳۲ء) "میدان عمل" (۱۹۳۴ء) "گؤدان" (۱۹۳۸ء) وغیرہ موضوع اور فن کے اعتبار سے اہم ناول ہیں

پریم چند نے اپنے ناولوں میں اس دور کے عوامی مسائل، زوال پذیر تہذیب کے نقوش، سماجی تعصب، جاگیرداروں کے ظلم و ستم، برہمنوں کی مار دھاڑ، بیواؤں کی لاچاری اور کسمپرسی، طبقاتی تفاوت، کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کی تصویر ناول کے کرداروں کی مدد سے کھینچی ہے۔ آل احمد سرور پریم چند کے بارے میں کہتے ہیں :

وہ غریبوں اور مظلوموں کے بہت بڑے ہمدرد ہیں۔ کسانوں کے جذبات اور دیہاتی زندگی کے مرقعے ان کے ہاں بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ جہالت، غربت اور بیماری، رسم و رواج کا بھوت، دولت کی غلط تقسیم، مذہب کے نام پر انسانیت کا خون، پریم چند سے دیکھا نہیں جاتا۔ (۱۴(

پریم چند کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے ناول کے فن کو اپنے اصلاحی مقاصد پر قربان نہیں کیا۔ علاوہ ازیں فن اور زندگی میں ایسی ہم آہنگی پیدا کی کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔ ڈاکٹر سہیل کے بقول:

پریم چند کے ناول سماجی اور سیاسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ ہر مسئلے پر ہر جہتی روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کی تصویروں میں تاریخیت کے ساتھ ساتھ

فن کاری بھی شامل رہتی ہے۔(۱۵)

ڈاکٹر قمر رئیس نے پریم چند کے ناولوں میں زبان وارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے ناولوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور (۱۹۱۲۔۱۹۰۴ء)۔ اس دور میں ان کی نثر میں وہ آہنگ، سلاست اور ربط نہیں ہے جس سے یہ کہا جائے کہ مصنف کو اظہار وبیان پر کمال حاصل ہو۔

دوسرا دور (۱۹۲۳۔۱۹۱۳ء) اس عہد کے ناولوں میں زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ پختگی اور متانت کا احساس ہوتا ہے۔

تیسرا دور (۱۹۳۶۔۱۹۲۴ء) اس دور میں ان کی زبان وبیان نہایت صاف اور پختہ ہو گئی۔

ایک ناول نگار کو ناول میں مختلف طریقہ اظہار وبیان سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثلاً واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، اور منظر نگاری وغیرہ میں اظہار بیان کی الگ الگ خصوصیات ہوتی ہیں۔ واقعہ نگاری میں پریم چند کا بیانیہ اسلوب بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ ایک کامیاب ناول نگار کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس حوالے سے پریم چند کے ناول کامیاب کہے جاسکتے ہیں۔

پریم چند نے سماج کی تشکیل نو کے لیے اپنی ناول نگاری کو اپنے عہد کی معاشی، سیاسی اور سماجی حالت کی عکاسی کے لیے وقف کر دیا۔ ان کے اس مشاہداتی اور تجرباتی عمل نے ان کے فن کو بھی نکھار بخشا یوں پریم چند ایک صاحبِ اسلوب اور رجحان ساز ناول نگار کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو پریم چند کی تحریروں میں سے ترقی پسندوں کو فکری راہنمائی ملی ہے۔ انور خواجہ اس بارے میں لکھتے ہیں :

پریم چند نے ہماری دیہاتی اور جاگیرداری نظام کے نیچے پستے ہوئے محنتی عوام کے بڑے سچے مرقعے پیش کیے ہیں۔ وہ اس نظام کو کسی بہتر اور ترقی پسند نظام سے بدلنے کا متمنی ہے۔ جہاں کڑی محنت کے عوض تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا اور پیٹ بھرنے کے لیے روٹی بھی میسر نہیں۔ پریم چند شعور میں اس زمانے کی کانگرسی تحریک کی آواز تھی۔ لیکن ساتھ ہی پرولتاری نظام کی آہٹ بھی تھی۔ پریم چند نے اپنے پیش رو نذیر احمد اور راشد الخیری کی طرح فن کو افادیت کی بھینٹ نہیں چڑھایا۔ اس نے جس نظریہ حیات پر اپنے فن کی بنیاد رکھی اس سے پورا خلوص برتا۔ ساتھ ہی فن کی نزاکتوں اور جمالی قدروں کا بھی احترام کیا۔ ایک بڑے فن کار کی طرح پریم چند کو اس بات کا احساس تھا کہ فن پر عبور اور قدرت حاصل کرنے کے بغیر فنکار اپنے نظریات کو وسیع طور پر پھیلا نہیں سکتا۔۔۔ پریم چند سے پہلے اردو ادب میں ہماری عام زندگی کے اتنے صحیح اور حقیقی عکس نہیں پیش کئے گئے تھے۔(۱۶)

ڈپٹی نذیر احمد سے پریم چند تک پہنچتے پہنچتے اردو ناول نے فنی ارتقا کی کئی منازل طے کیں۔ اولین ناول نگاروں کے ہاں اردو ناول میں بلاشبہ فنی لوازمات مثلاً ہئیت، پلاٹ، موضوع، کردار اور مکالمہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ فکری حوالے سے بھی کچھ خامیاں محسوس کی جاتی رہی ہیں لیکن ان نقائص اور خامیوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اولین ناول نگاروں نے اس کی نوک پلک درست کی اور خیالی داستان کو نیا رخ دے کر ناول کی حقیقی شکل عطا کی اور اس طرح قصے اور کہانی کو ایک نیا وجود بخشا۔ انھوں نے فن ناول نگاری میں عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کیا اور ان کے مطابق اردو ناول کو فکری وفنی لوازمات سے مزین کیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردو ناول اپنے ارتقائی سفر کی طرف گامزن رہا۔ جس کی بدولت آج اردو ناول کو دیگر زبانوں میں لکھے جانے والے ناولوں کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اردو ناول کے اس ارتقائی سفر میں اولین ناول نگاروں کا کلیدی کردار ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، سرور اور فسانہ عجائب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۰

۲۔ وقار عظیم، اردو ناول کا ارتقا، مشمولہ سویرا (سہ ماہی) کراچی، ۱۹۷۶ء

۳۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی احوال و آثار، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۴۸

۴۔ محمد احسن فارقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۶۲

۵۔ ایضاً، ص ۸۸

۶۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو میں تاریخی ناول، گنج شکر پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۴، ص ۳۲۰

۷۔ وقار عظیم، داستان سے افسانے تک، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۵۔۱۳۴

۸۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، سرسید بک ڈپو علی گڑھ، ۱۹۶۳ء، ص ۱۵۱۔۱۵۰

۹۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۸۲

۱۰۔ محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۸۶

۱۱۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، اردو میں تاریخی ناول، ص ۳۲۱، ۳۲۲

۱۲۔ سہیل بخاری، اردو ناول نگاری، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۶۰، ص ۹۵

۱۳۔ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ اور تنقید، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۲۹۰

۱۴۔ آل احمد، سرور، تنقیدی اشارے، ادارہ فروغ اردو، امین آباد، لکھنؤ ۱۹۵۵ء، ص ۱۷۔۱۶

۱۵۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری، ص ۱۹۴

۱۶۔ انور خواجہ، اردو ناول نگاری اور اس کا فن، مشمولہ: ادبی دنیا، شمارہ:۳، ص ۱۰۳